ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 3, Issue I, (Jan to March 2022)

ماخذ تحقیقی مجلہ

ڈاکٹر نیلم

ایسوسی ایٹ پروفیسر، گورنمنٹ سٹی گرلز کالج گلبہار پشاور

ڈاکٹر ندیم حسن

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو، جامعہ چترال

احمد ندیم قاسمی کے افسانے "پاؤں کا کانٹا اور تبر" کا تجزیہ

Dr. Neelam

Associate Professor, Government City Girls College Gulbahar Peshawar.

Dr. Nadeem Hassan

Assistant Professor, Department of Urdu, Chitral University.

A Critical Review of Ahmad Nadeem Qasmi Short Story Pawon Ka Kanta Aor Tabar

In the early period, Ahmad Nadeem Qasmi was a supporter of the fact that writing is essential for the creator to reflect the environment in which he grew up, because those who spend day and night in the dust and dirt of the villages cannot imagine that the lights are shining. What darkness is hidden in the light of the cities? Similarly, those who are robbed of the pleasures of the comfortable life of the city cannot realize that what the name of deprivation and helplessness is. However, going forward, this limit of time and space Bandi disliked his art. So he covered cities and the world scene with villages. A positive aspect of his personality is that he is a good poet and an excellent fiction writer at the same time. They use their poetic skills for their fictional style, and wherever they feel the need in poetry and poetry, they use their art of fiction writing. This is the reason that neither their idea is a copy of anyone. And the style is not borrowed from anyone. Rather, whatever is, is pure and theirs. He has based his opinion on personal experiences and observations. That's why they see pictures of life. They get into the characters of each of their fictions and get to understand the real truths.

ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 3, Issue I, (Jan to March 2022)

ماخذ تحقیقی مجلہ

Keywords: *Ahmad Nadeem Qasmi, Experience, Fiction, Helplessness.*

راشد الخیری، پریم چند، سجاد حیدر یلدرم، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، عصمت چغتائی، انتظار حسین، بانو قدسیہ، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، منشا یاد، قراۃ العین حیدر، غلام عباس، شوکت صدیقی، ممتاز مفتی اور زاہدہ حنا ایسے چند نام ہیں۔ جنھوں نے نا صرف اردو افسانے کی بنیاد رکھی، بلکہ اس کارشتہ سماج سے قائم کیا۔ ان افسانہ نگاروں نے اپنے اپنے رنگ میں لکھا اور اردو افسانے کے دامن کو معطر کیا۔ اس کاروان کے ایک اہم تخلیق کار احمد ندیم قاسمی بھی ہیں۔ ان کے ہاں دیہات کے مسائل زیادہ تر نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ قاسمی صاحب کے ہاں ہمیں شہری زندگی کی ہنگامہ خیزیوں کی تصویر بھی نظر آتی ہے۔ تاہم ان کے ہاں انسانی نفسیات کو بھی جس مہارت سے پیش کرنے کی سہی کار فرما ہوتی ہے وہ اپنی مثال اپ ہے۔ احمد ندیم نے افسانوں کے پرانے پیراہن کو جدید حیات کے بیل بوٹوں سے مزین کیا۔ ان کے افسانوں میں ندرت اور جدت ہے، اس خوبی کو ذہن میں رکھتے ہوئے فوزیہ اختر کی رائے کچھ یوں ہے:

> ”جدت پسندوں کو تجربات کا سہی لیکن تجربہ روایت سے جدا ہو کر نہیں کیا جا سکتا۔ قاسمی صاحب کے تمام افسانوی تجربات اپنی مٹی تہذیب، روایت، تجربے اور جلسے جڑے ہوئے ہیں۔“(۱)

اپنی مٹی، تہذیب اور روایت سے جڑے رہنے کی یہیں خوبی ہے جس نے احمد ندیم قاسمی سے لازوال افسانہ لکھوائے۔ ابتدائی دور میں احمد ندیم قاسمی اس بات کے حامی تھے، کہ لکھنے کے لیے لازمی ہے کہ جو تخلیق کار جس ماحول کا پروردہ ہو اسی کی عکاسی کرے، کیونکہ دیہات کی دھول و مٹی میں شب و روز گزارنے والوں کو یہ اندازہ نہیں ہو سکتا کہ جگمگاتے شہروں کی روشنی میں کون کون سی تاریکیاں چھپی ہوئی ہیں۔ اسی طرح شہر کے سہولت بھری زندگی کے مزے لوٹنے والوں کو یہ احساس نہیں ہو سکتا کہ محرومی اور لاچارگی کس بلا کا نام ہے۔ تاہم آگے جا کر زمان و مکان کی یہ حد بندی ان کے فن کو ناگواری گزری۔ اس لیے انہوں نے دیہات کے ساتھ شہر اور عالمی منظر نامے کا احاطہ کیا۔ اپنے فنی و فکری دائرے کو پھیلانے کے لیے انہوں نے گاؤں سے لاہور جیسے علمی اور ادبی شہر کا رخ کیا، تو ان کے سوچ و فکر کے دھاگے زمین حقائق کے ساتھ نئے پہلوؤں سے جڑ گئے۔ لیکن ان کے افسانوں کا مجموعی جحان

ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 3, Issue I, (Jan to March 2022)

ماخذ تحقیقی مجلہ

وہی طبقاتی تقسیم رہا ،کہیں پہ ظالم ومظلوم کی داستانیں، تو کہیں پر امیروغریب کے خانوں میں بٹے ہوئے انسانی معاشرے کو طنز کا نشانہ بنایا۔اپنے مجموعے" طلوع غروب" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> "میں نے پھٹے ہوئے ہونٹوں سے آہوں کی دھوئیں اٹھتے دیکھے ہیں۔ میں نے موت کی چیڑیوں کو تیرہ نصیب مریضوں کے سرہانے دانت کپکپاتے اور انگلی چٹخاتے دیکھا ہے۔"(۲)

ان کی شخصیت کا ایک مثبت پہلو یہ بھی ہے کہ وہ بیک وقت اچھے شاعراور بہترین افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوی اسلوب کے لیے شعری صلاحیتوں کو بروئے کارلاتے ہیں، اور جہاں شعر و نظم میں ضرورت محسوس کرتے ہیں۔وہاں اپنے افسانہ نگاری کے فن سے استفادہ کر لیتے ہیں ۔یہیں وجہ ہے کہ ان کے ہاں نہ تو خیال کسی کا چربہ ہے اور نہ اسلوب کسی سے مستعار لیا ہوا ہے۔ بلکہ جو کچھ ہے،خالص اوران کا اپنا ہے۔ انہوں نے اپنے من کی بنیاد ذاتی تجربات اور مشاہدات پر رکھی ہے۔ اس لیے ان کے ہاں زندگی کی تصویریں نظر آتی ہیں۔وہ اپنے ہر افسانے کے کردار میں اتر کر اصل سچائیوں کا ادراک حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ بقول پروفیسر قمر رئیس:

> "ان کے بیشتر افسانوں کی بنیاد کوئی نفسیاتی گروہ ہوتی ہے جیسے وہ انسانی سیرت کے نہاں خانوں میں بڑی ہنر مندی اوررژف بینی سے دکھاتا ہے اس کا تجزیہ کرتا ہے اور اخر میں اخر میں کھولتا ہے۔لیکن اس نفسیاتی حقیقت کے گرد جو عام ذہنی فضا ہوتی ہے۔ اکثر اس نفسیاتی گروہ کے کھلنے سے اس کا طلسم بھی کھل جاتا ہے یہی ندیم کے فن کا وہ منفرد انداز ہے جو اسے دوسرے افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتا ہے۔"(۳)

مذکورہ رائے کی روشنی میں ان کے افسانے" پاؤں کا کانٹا "میں موجود نسائی کرداروں کا مطالعہ کیا جائے تو ہم باسانی اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔ کہ ان کا مشاہدہ کس قدر عمیق تھا۔اور وہ انسانی نفسیات کا کتنا ادراک رکھتے ہیں۔ہمارے معاشرے میں عورت کا بچپن سے ہی مالِ مسروقہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے جذبات کو پہلے اپنے گھر میں اور پھر سسرال میں اس طرح دبایا جاتا ہے کہ وہ کہ وہ عمر بھر ایک جذباتی گھٹن کا شکار رہتی ہے ۔یہیں وجہ ہے کہ جب بھی اسے کوئی موقع ملتا ہے تو وہ کسی نہ کسی جرم

کی طرح رائے راغب ہو کر اپنے اندرونی ابال سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ رویہ ابتدا میں تو اتنا نقصان دہ نہیں ہوتا، لیکن بعض اوقات بڑی خطرناک صورت میں سامنے آسکتا ہے ۔یہ ضروری نہیں کہ تمام عورتوں میں شدت صرف جذبات کی ہو،اکثر اوقات مجرمانہ ذہنیت بھی اس کے پیچھے کار فرما دکھائی دیتی ہے ۔احمد ندیم قاسم اپنے افسانے ''پاؤں کا کانٹا ''میں عورت کی ذات کا وہ پہلو سامنے لاتے ہیں ۔جس کی مثالیں ہمارے معاشرے میں عام مل جاتی ہیں۔

یہ ایک سوتیلی ماں کی کہانی ہے۔ جو اپنے سوتیلے بیٹے کو مختلف طریقوں سے ذہنی اور جسمانی اذیت پہنچاتا ہے۔ وہ اگر کبھی وہ اپنے باپ کے سامنے سوتیلی ماں کی شکایت کرتا ہے ،تو باپ الٹا اسے مار کر شرمندہ کر دیتا ہے۔ ایک دن اس کے پاؤں میں کانٹا چبھتا ہے۔ کانٹا نکلتے وقت جب وہ تکلیف سے چیختا ہے تو اس کی سوتیلی ماں اکر اسے مارتی ہے اس دوران پاس پڑے ہوئے ڈیوٹ سے اس کے کپڑوں میں آگ لگ جاتی ہے ۔جس سے وہ بری طرح جھلس جاتا ہے ۔جب اس کے باپ کو پہلے بیوی کی روح اپنے سامنے آنسو بہاتی ہوئی محسوس ہوتی ہے تو اس کا دل ہم بھی دل بھی نرم پڑ جاتا ہے۔

> ''ایک موقع پر جب وہ غصے کی حالت میں بیوی کو پکارتا ہے تو اس کی بے حسی اس وقت بھی اس کے سر پر سوار رہتی ہے وہ گھی میں لقمہ بھگو کر بولی اچھا ہو جائے گا۔ بچے جلتے ہی رہتے ہیں۔تم پر تو جیسے قیامت ٹوٹ پڑی ہے اچھا ہو جائے گا کمبخت ۔تم کیوں اپنی جان کو کھاتے ہو۔ ادھر آؤ کھانا کھا لو ۔''(۴)

اگر چہ سوتیلی ماں کی سرد مہری سے اس کے باپ کو اب احساس ہو جاتا ہے ۔اس لیے وہ اپنی پہلی بیوی سے بہت شرمندگی محسوس کرنے لگتا ہے۔ جس کے ساتھ اس نے اپنے والدین کی باہمی دشمنی سے بے پرواہو کر ہمیشہ کے لیے ایک ہونے کا عہد کیا تھا ۔وہ اپنے بیٹے کا علاج تو کراتا ہے لیکن اس کی تمام کوششوں بے سود ثابت ہوتی ہے۔اس کی حالت روز بروز بگڑتی چلی جاتی ہے، حکیم کا خیال تھا کہ اس کے زخموں کو روزانہ کوئی چھیڑ دیتا ہے ایک دن جب اس کی حالت بگڑ جاتی ہے تو اس کے باپ کے اندر بے چینی اور پشیمانی کی آگ دہکنے لگتی ہے مگر اس کی حال میں پہنچاکر بھی اس کی سوتیلی ماں پر اثر نہیں ہوتا اور وہ مسلسل اپنے آرائش و زبائش میں لگی رہتی ہے۔اس دوران بچے ایک بار ہوش آتا ہے۔لیکن یہ

سلسلہ پھر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا ہے۔ بچہ زخموں کی تاب نہیں لاتا اور وہ جانبر نہیں ہو پاتا ۔اس افسانے کے بارے میں ڈاکٹر انور انور احمد رقم طراز ہے:

> ''پاؤں کا کانٹا ایک جذباتی افسانہ ہے جس میں سوتیلی ماں کو بچے کی روح کا ہی نہیں جسم کا بھی قاتل دکھایا گیا ہے۔بچے کی بیماری، بھوک اور بڑھتا زخم مل جل کر افسانے کو ایک نہایت موثر قصے کی سطح پر لاتے ہیں۔''(۵)

ڈاکٹر انوار نے اس افسانے سے متعلق ایک سرسری رائے قائم کی ہے کہ ایک عام سا افسانہ ہے۔ لیکن اس افسانے کے کردار کے باطن کو جب ہم خارجی حقائق سے ملا کر سوچتے ہیں تو یہ افسانہ کہیں حوالوں سے خصوصی اہمیت کا بن جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں اصل بات رویوں کے پیچھے موجود صورتحال اور صورتحال کے آئینے میں خاص ذہنیت کا سامنے آناہے۔ان پس پردہ محرکات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ کردار کے اندرونی انتشار کو محسوس کیا جائے ۔یوں تو مغربی ممالک میں شراب پی کر ماؤں کاذہنی پریشانی کے عالم میں بچوں پر بے رحما نہ تشدد دکھایا جاتا ہے مگر مشرقی معاشرے میں ایسا رویہ عموما سوتیلے بچوں کے ساتھ روا رکھے جاتےہیں۔ چونکہ ہمارے معاشرے میں عورتوں کا مقام قابل تکریم سمجھا جاتا ہے ۔اور عام طور پر کسی مجرم کو اس کے سامنے نہیں لایا جاتا ۔اس لیے اس چیز کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اکثر عورتیں مخفی یا پوشیدہ فطرت جرم کی طرف راغب ہو جاتی ہیں۔ اس قسم کے جرائم کی مثالیں عورتوں میں ہی ملتی ہیں۔ مردوں کا طریقہ واردات ان سے مختلف ہوتا ہے۔جہاں تک سوتیلی ماں باپ کے حوالے سے نفرت اور بیزاری کے جذبات کا معاملہ ہے تو یہ کم یا زیادہ صورتوں میں موجود ضرور رہتے ہے لیکن اس کے اظہار کا طریقہ اور مواقع مختلف ہو سکتے ہیں ۔انعام الرحمن سحری کے بقول:

> ''سوتیلی ماں کا اپنے بچوں یا سوتیلے باپ کا اپنے بچوں سے نفرت کا جذبہ اپنارنگ ایک دن میں نہیں دکھاتا ،لیکن اندر اندر سے افراد کے دماغ کو شکنجے میں کستا جاتا ہے۔'' (۶)

سوتیلے پن کا نتیجہ بچے کی قتل کی صورت میں سامنے آتا ہے۔افسانے میں موجود کردار'' کریم'' کی سوتیلی ماں کا اگر جائزہ لیا جائے۔ تو اس انتہا پسندانہ اقدامات کے پیچھے اس کے سماج میں موجود

ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 3, Issue I, (Jan to March 2022)

ماخذ تحقیقی مجلہ

کمزوریوں کے ساتھ ساتھ اس کی جنسی و جذباتی کیفیت بھی متحرک نظر آتی ہے ۔سوتیلی ماں سے وابستہ ظلم اور ستم کا تصور ہمارے سماجی رویہ ہے۔ جس سے کوئی بھی عورت اپنادامن نہیں چھڑا سکتی۔ اس طرح ماں باپ کے گھر میں بیٹی کی جس طرح کھڑی نگرانی ہوتی ہے۔ اس سے نکلنے کے لیے وہ شوہر کے گھر کو درِنجات سمجھتی ہے۔ جہاں وہ اپنی تمام تر جنسی جذبات کو تسکین پہنچانے کی خواہش لے کر جاتی ہے، اور اس سب کچھ چھوڑ کر جانے کے باوجود وہاں بھی اگر خود کو دھنسی سمجھتی ہے۔اوراپنے شوہر کے درمیان کسی اور وجود کو پاتی ہے تو اس کی تشنگی اسے بےحال کر دیتی ہے ۔یہاں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر عورت اپنے اور اپنے شوہر کے بیچ کسی وجود کو قبول نہیں کر سکتی تو پھر اپنے بچوں کا وجود اس کے لیے کیسے قابل قبول ہو سکتا ہے ۔اس ضمن میں یہ بات وضاحت طلب ہے کہ اپنے بچوں اس کے وجود کا حصے ہوتے ہیں۔جبکہ باقی ہر وجود اسے بوجھ محسوس ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے شوہر کی ماں کو بھی اپنا رقیب سمجھنا شروع کر دیتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ ان کے درمیان کوئی دوسرا وجود حائل نہ رہے۔

کریم کی سوتیلی ماں کا اسے قبول نہ کرنا اور اسے خود سے دور رکھنے کی ایک وجہ اس کے شوہر کا رویہ بھی ہے ایک لحاظ سے یہ کہنا بجا ہوگا کہ اس رویے میں جارہانہ انداز اس کے شوہر کے رویے سے ہی ایا ہے جب وہ دیکھتی ہے کہ کس طرح اس کا شوہر شوہر نے محبت سے پانے والی پہلی بیوی کو بھلا دیا تو اسے یہ خوف لاحق ہو جاتا ہے کہ اس کے بچے کی وجہ سے وہ بھی ایسے کھو سکتی ہے دوسری طرف اس کے ذہن کے نیہا خانوں میں کہیں یہ بات بھی موجود رہتی ہے کہ اگر وہ اپنی محبت کا نہیں ہو سکا تو اس کا بھی نہیں بن سکتا احمد ندیم قاسمی کے افسانوں سے متعلق یہاں ڈاکٹر سعادت سعید کی رائے اس کردار کی نفسیاتی کیفیت کو تقویت دیتا ہے وہ لکھتے ہیں احمد ندیم قاسمی کے افسانے ایک زندہ شعور کے حامل افسانہ نگار کے افسانے ہیں انہوں نے معروضی اور سائنسی نقطہ نظر سے زندگی کے حقائق کا کچھ اس طور مطالعہ کیا ہے کہ باطنی رجحانات جذبات جذبے کی کہ اسرار اور رومانی رویے بھی نظر سے اوجل نہیں ہو پاتے۔

یہی وجہ ہے کہ زیر بحث افسانے میں سوتیلی ماں کا یہ کردار شوہر کی پہلے بیوی کی کوکھ سے جنم لینے والے بیٹے کو اپنانے اور اس کی خدمت کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں ہوتا۔ اس کے

ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 3, Issue I, (Jan to March 2022)

ماخذ تحقیقی مجلہ

علاوہ یہ پہلو بھی توجہ طلب ہے کہ اس افسانہ میں کہیں اس کے اپنے بچوں کا تذکرہ بھی نہیں ہے ۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کمی کا احساس بھی اسے اندر سے دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے۔ کیونکہ عام مشاہدے میں یہ بات آتی ہے کہ اگر عورت کے ہاں اولاد نہ ہو تو وہ حسد کے باعث سوتیلے بچوں کو تشدد کا نشانہ بناتی ہے۔ بغیر کسی مقول وجہ کہ ایسے تشدد میں عورتیں مجرم کم اور نفسیاتی مریض زیادہ ہوتی ہیں۔ لیکن کریم کی ماں بیک وقت کہیں قسم کی نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہے۔ دیکھا جائے تو اس کا مسئلہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے گھر میں آخر تک اپنی اجارہ داری قائم رکھنا چاہتی ہے۔ اسے یہ خدشہ رہتا ہے کہ اگر اس کے رویے میں نرمی آگئی تو عین ممکن ہے کہ گھر کے دوسرے لوگ اس پر مسلط ہو جائیں گے۔ اس لیے وہ کریم کو نفسیاتی طور پر کمزور بنا کر اپنے زیرِ تسلط رکھنا چاہتی ہے۔ اپنے گھر اور شوہر پر مکمل دسترس رکھناچاہتی ہے۔یہ خواہش ہر عورت کے اندر موجود ہوتی ہے۔ شادی کے بعد وہ شوہر کے سبب جس سرشاری اور خود اعتمادی سے روشناس ہوتی ہے۔ اسے وہ کسی قیمت پر ہاتھ سے جانے نہیں دیناچاہتی۔بقول ڈاکٹر سلیم اختر کہ:

> ”اس کی بنیادی وجہ تو اس کا نسائی پندار اور منفی غرور ہے۔ وہ یوں سوچتی ہے کہ وہ اپنے پربہار دنیا چھوڑ چھاڑ کر اس کی زندگی میں بہار بن کر آئی اور اپنے جسم کے اچھوتے بہاریں اسے سونپ دیں۔اب اگر ان سب کے معاوضے میں وہ اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے بس میں نہیں رکھ سکتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بحیثیت عورت اس میں کوئی خامی ہے۔ اس طرح کی صورتحال سے پیدا شدہ احساس کمتری اس کے اندر ایک زندہ گالی بن کر اس کے شعورے کنکھجورے کی طرح چپک کر رہ جاتے ہیں۔“(۷)

اس بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ خود کو مکمل عورت منوانے کی شدت میں کریم کی سوتیلی ماں‌عدل سے ہٹ کر انتہا پسندی کے دائرے میں داخل ہو جاتی ہے۔ جس کے باعث وہ اس معصوم بچے کی جان لینے سے بھی نہیں کتراتی اور اسے اپنے راہ سے ہٹانے کے لیے انتہائی بے دردی سے اس کے زخم چھیلتی ہے ۔جبکہ کریم کے خوف اور بے بسی کا یہ عالم ہے کہ وہ سب کچھ خاموشی سے دیکھتا،سہتا اور محسوس کرتا ہے اور اخر میں موت کو گلے لگا لیتا ہے لیکن اپنی زبان سے کچھ نہیں بولتا۔

ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 3, Issue I, (Jan to March 2022)

ماخذ تحقیقی مجلہ

تبر

احمد ندیم کسی تعارف کے محتاج نہیں۔آپ ایک نامورادیب،معروف شاعر، کالم نگار اور صحافی ومدیر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ قاسمی صاحب اگرچہ مختلف شعبہ زندگی سے وابستہ رہے مگر افسانہ نگاری ان کا خاص میدان ہے۔جس میں وہ بھرپور انداز استعمال میں نظر آتے ہیں۔"کپاس کا پھول" ان کا چودھواں افسانوی مجموعہ ہے۔جو ۱۹۶۲ء میں لکھا گیا،لیکن یہ ۱۹۷۳ء میں منظر عام پر نظر آیا۔اس مجموعہ میں ۱۸ افسانے شامل ہیں۔قاسمی صاحب نے ان کو تاریخی ترتیب سے طبع کیا اور ہر تخلیق کا سن آخر میں درج کیا ہے۔اس مجموعہ میں موضوعات کا وہ تنوع اور وسعت ہے۔ماں کی محبت، لڑائی جھگڑے ،گھریلو ناچاکی،توہم پرستی، نافرمان اولاد،قرض کی لعنت، غربت امیر طبقے کی بےرہ روی کو نہایت سلیقے سے پیش کیا گیاہے۔ افسانہ"تبر" اس مجموعہ میں شامل ہے۔یہ افسانہ نفسیاتی نوعیت کا ہے ،احساس کمتری جو انسانی نفسیات کا اہم جز ہے۔"تبر"اس کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ شہباز خان،دلیر خان،جنت خان اور نواز اللہ اس کے مرکزی کردار ہیں۔ انسانی نفسیات کے ساتھ ساتھ دیہی معاشرے بھی "تبر"کا اہم حوالہ ہے ۔اس افسانہ کی زبان سادہ،سلیس اور انداز بیاں روا ں ہے۔ ثقیل اور باری بھرکم الفاظ کی بجائے مصنف نے نہایت سادہ الفاظ میں بات کی ہے۔

"تبر "اس مجموعے کا پہلا افسانہ ہے۔ اس اس منفرد نوعیت کا عنوان قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتا ہے ۔"تبر "کا مطلب " الہ حرب" کلہاڑا یا کٹوا ہے۔ قاری یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ یقینا اگے جا کر کہانی میں اس "الہ حرب "کا استعمال بھی بے دردی اور بے رحمی سے کیا جائے گا۔ مگر کیسے ؟،کیوں؟ اورکس کے خلاف ؟یہی وہ سوالات ہیں۔ جو قاری کے تجسس کو مزید ہوا دیتے ہیں ۔اور قاری افسانہ پڑھے بنا نہیں رہ سکتے۔یہ افسانہ نفسیاتی نوعیت کا ہے اس احساس احساس کمتری جو انسانی نفسیات کا نہایت اہم مسئلہ ہے اس افسانے میں اس کی عمدہ اور بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے بقول :

> "تبر ایک کامیاب نفسیاتی افسانہ ہے ۔ایک چھوٹا قد جس احساس کمتری کو جنم دیتا ہے اور پھر اس سے انسانی شخصیت کس کس طرح متاثر ہوتی ہے ۔یہ اسی نفسیاتی الجھن کا بڑا کامیاب تجزیاتی مطالعہ ہے۔" (۸)

افسانہ کی ابتدا ہی میں اس کے مرکزی کردار شہباز خان کی یہ نفسیاتی الجھن واضح ہو جاتی ہے۔مثلاً

> ''سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ شہباز کا قد بہت چھوٹا تھا۔ لوگ اس کے قریب سے گزرتے تو اس سے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ سب کا برخوردار ہے اور جسے وہ کترہ کرنہ نکلا تو اس کے سر پر ہاتھ پھیر دیں گے۔ اس نے بڑی بڑی مونچھیں بھی رکھ لی تھی جنہیں وہ ہر صبح گھی سے چپڑتا تھا ۔اس نے قلمیں بھی کانوں کی لو تک پھیلائی تھی۔ وہ اپنے پٹوں میں بھی ہاتھی دان کا ننھا سا کنگا کچھ اس ادا سے لگا تھا کہ وہ اس کے دو طروں والی پگڑی نہیں چھپتی۔۔۔۔پھر اس کے خدم تبر رہنے لگی پھراس کے ہاتھ میں تبر رہنے لگی تھی جس کا دستہ اس قد سے زیادہ کم تھا۔''(۹)

مصنف نے نہ صرف اس کہانی میں طبقاتی تفاوت،کمزور اور طاقتور کا تقابل بہت عمدگی سے پیش کیا ہے۔بلکہ شہباز خان اور دلیر خان کے ذریعے معاشرے کے کمزور اور طاقتور افراد کی نمائندگی بھی دکھائی ہے۔ایک شدید احساس کمتری کا شکار ہے، تو دوسرا احساس برتری میں مبتلا ہے۔ دونوں کرداروں کی نفسیات دکھا کر مصنف نے معاشرے کے ایسے منفی افراد پر چوٹ کی ہے۔ جوخود توکسی بے چینی اور اس اضطرب میں مبتلا ہوتے ہیں۔ مگر اپنے برے اثرات اپنے ارد گرد بسنے والے افراد پر بھی مرتب کرتے ہیں۔ انسانی فطرت ہے کہ وہ منزل کو پانے کے لیے یا اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے دوسروں کو بے دھڑک اپنا آلہ کار بنا لیتے ہیں ۔اب اس مقصد کے حصول کے لیے بھلے کسی کی جان، مال اور عزت چلی جائیں۔ مگر ان خود غرض انسانوں کواس بات سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ان کی خود غرضی انتہا پر ہوتی ہے ۔انسانی فطرت کے اس عجیب وصف کو قاسمی صاحب نے دلیر خان اور شہباز خان کے ذریعے آشکار کیا ہے۔ دلیر خان جو خود تو ''اللہ دیس ''کی گھوڑی سے بھی ڈرتا ہے مگر اس کے خاتمے کے لیے شہباز خان کو آلہ کار بناتا ہے۔ شہباز خان کا المیہ یہ ہے کہ وہ بے خبری میں نا صرف اس مقصد کے لیے استعمال ہوا۔ بلکہ تہی دامن بھی رہا۔

مصنف نے اس افسانے میں معاشرتی نا ہمواری کی بھرپور عکاسی کی ہے ایک طرف وہ گاؤں کی چوپال کا اندرونی منظر پیش کر کے اس سے جڑے افراد کی ذہنی و فکری حالت کو قاری کے سامنے لاتا ہے۔ تو دوسری طرف انصاف کے دعویدار اور منصفی کے اداروں کے اصل چہرے بھی بے نقاب

کرتا دکھائی دیتا ہے۔ جہاں سچ کی بجائے جیت ہمیشہ جھوٹ اور طاقت کی ہوتی ہے ۔جہاں ثبوت سے زیادہ دلائل پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔ نور اللہ اور شہباز خان قتل کے الزام میں جیل جاتے ہیں۔ان کے جیل جانے سے لے کر عدالت میں ہونے والی پیشیں، کیس کی سنوائی، آخر میں دونوں کی باعزت رہائی اور بری الزمہ ہونے تک سب معاشرتی ناہمواری کامنہ بولتا ثبوت ہے۔

فکری حوالے سے دیکھا جائے تو اس افسانے کی ایک اہم کامیابی یہ بھی ہے کہ اس نے انسانی نفسیات کی ایک الجھی ہوئی گتھی کو بھی بڑی عمدگی سے سلجھایا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ کوئی بھی شخص فطرتا برا نہیں ہوتا۔ نہ ہی محض ذاتی برائی کے سبب اس سے غلطی سرزد ہوتی ہے۔بلکہ اندرونی و بیرونی ہر طرح کے محرکات مل کر اسے گناہ پر مادہ کرتے ہیں۔ شہباز خان کی ذاتی کمزوری تو اسے معاشرے کے خلاف رد عمل پر اکساتی ہی ہے، لیکن گاؤں کے لوگوں کا بار بار اس کے سامنے اس کے چھوٹے قد کو بنیاد بنا کر کیجانے والی تانہ زنی اس کےاحساس جرم کو بھڑکاتی ہے۔ اور یوں وہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔مثال کے طورپر یہ کہنا:

> ''بالشت برقد والے لوگ چھرا دشمن کے پیٹ میں مارتے ہیں تو وہ ان کی ٹانگوں کے بیچ میں سے نکل جاتا ہے"۔(۱۰)

''تبر'' فکری اعتبار سے جہاں موثر اور کامیاب افسانے کی حیثیت رکھتا ہے ۔وہیں فنی اوصاف کا بھی حامل ہے۔ افسانہ''تبر'' کے پلاٹ کا نہایت مضبوط ہے۔ کہانی کا تانہ بانہ مصنف نے بہت عمدگی اور باریک بینی سے بنا ہے،کہانی ابتدا سے اخر تک خاص ترتیب کے ساتھ چلتی ہے ۔کہیں بھی غیر ضروری تفصیلات وبےکار واقعات بیان نہیں کیے گئے ۔پلاٹ پر مصنف کی گرفت اتنی مضبوط ہے کہ شروع سے لے کر آخر تک کہانی میں قاری کی دلچسپی میں بال برابر بھی فرق نہیں آنے پاتا۔وحدت تاثر جو کسی بھی افسانے کے لیے نہایت اہم اور ضروری جز ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے اپنے اس افسانے میں اس کو اخر تک برقرار رکھا ہے۔ افسانوی ادب میں کرداروں کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں کہانی کی کامیابی کا انحصار زیادہ ترمضبوط پلاٹ اور جاندار کرداروں پر ہوتا ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار شہباز خان ہے۔ جس کے گرد پوری کہانی گھومتی ہے۔ یہ ایک متحرک کردار ہے۔ جوں جوں کہانی اگے بڑھتی ہے،یہ کردار بھی اپنی ارتقائی منازل کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ کہانی کا آغاز اسی کردار سے ہوتا

ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 3, Issue I, (Jan to March 2022)

ماخذ تحقیقی مجلہ

ہے۔ جس میں مصنف نے جزئیات نگاری سے کام لیتے ہوئے۔ اس کا حلیہ بیان کیا ہے۔ عجیب و غریب شخصیت وحلیہ کے مالک یہ کردار اگرچہ افسانے میں موجود افراد کی توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کرا سکا۔ مگر قاری کو شروع سے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور قاری کا فطری تجسس اس افسانے پڑھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ کہانی میں قاسمی صاحب نے شہباز خان کا جتنا چھوٹا قد دکھایا ہے۔حوصلہ اس کردار کا اتنا ہی بلندی پر ہے۔ اپنی شخصی خامیوں کے باعث وہ کسی کو متاثر نہ کر سکا ۔مگر اپنے جاندار مکالموں سے نا صرف وہ حاضرین محفل کو حیران کرتا ہے۔ بلکہ قاری کو بھی حیرت کا شکار کرتا ہے۔ ایک بار گاؤں کے نامی بدمعاش دلیر خان نے اس کی ہنسی اڑائی تو شہباز خان نے اس کا جواب دینے کے بجائے شام کو اس کی چوپال میں اپنی تبر سمیت داخل ہو کر اس کو لڑنے کے انداز میں کچھ یوں مخاطب کیا :

> ''دلیر خان۔۔۔۔۔آج تم نے بھری گلی میں میری ہنسی اڑائی ہے۔ مگر بھائی نہ دلیری نام سے آتی ہے نہ جواں مردی قد سے پیدا ہوتی ہے۔یہ سارا جھگڑا حوصلے کا ہے،اور مجھ میں اتنا حوصلہ ہے کہ میں تمہاری ہی چوپال پر تمہارے ہی دس۱۵ آدمیوں کے درمیان بالکل اکیلا آؤں اور کیونکہ آج کے بعد میری ہنسی نہ اڑانا کہیں مجھے اپنی تبر سب سے پہلے تم پر ہی نہ آزمانی پڑ جائے۔''(۱۱)

پھر کہانی میں کہیں ایسے مواقع آتے ہیں۔ جہاں شہباز خان اپنے مضبوط لب لہجے سے کام لیتا ہے اور دلیرانہ انداز گفتگو کا اظہار کرتا ہے۔جو قاری کے ذہن میں بہت سے سوالات چھوڑ جاتا ہے کہ اتنا چھوٹا قد اور ایسی بڑی بڑی باتیں، کچھ کر گزرنے کا عزم حوصلہ ،اس بالشت بھر والے میں کیسے درآیا؟ دراصل گاؤں کے افراد کی بےپروائی شاید وہ ہنس کے سہہ ہی جاتا ہے۔ مگر دل کے ہاتھوں مجبور تھا جسے چاہا، اس کی خاطر اپنید کان بھی گروی رکھ دی۔ اس کی بے مروتی نہ برداشت کر سکا۔اس سے اللہ دین کی منگیتر جنت بی بی کی ہنسی برداشت نہیں ہوئی۔ اس روز اس نے کھانا نہیں کھایا ۔اور لحاف میں منہ چھپا کر روتا بھی رہا۔ اپنی انگشتِ شہادت کی پور پر باپ کی پرانی تبر کو بھی آزماتا رہا۔ اور پھر خود اذیتی کو بے حس کر دیا ۔یہ ''بالشت بھر والے'' اس افسانے میں یکے بعد دیگرے دو قتل کر ڈالتا ہے۔ اس کے پہلے قتل کے بعد اور نا تجربہ کاری سے گھبرا کر جب دلیر خان اس سے پوچھتے ہے۔کیا تمہارے سر پر

ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 3, Issue I, (Jan to March 2022)

ماخذ تحقیقی مجلہ

خون سوار تو نہیں ہو گیا؟ تو شہباز خان اپنے جواب سے نا صرف دلیر خان بلکہ قاری کو بھی چونکا دیتا ہے:

> ''یہ میرا پہلا خون ہے۔ دلیر خان میرا ظرف اتنا چھوٹا نہیں کہ میں تمہیں بھی قتل کر دوں تو سیٹی بجاتا پھروں۔'' (۱۲)

پہلا خون وہ اپنی معشوق کے شوہر کا کرتا ہے کہ شاید اب وہ اس کو حاصل کر سکے گا۔ جنت بی بی کو بے رحم شوہر سے نجات دلوانے کے بعد شہباز خان اس کے ساتھ سپنے سجانے لگتا ہے۔ مگر یہ سب سپنے اس وقت چکنا چور ہوتے ہیں۔ جب وہ پھانسی سے بچ کر اور جیل سے رہائی کے بعد واپس گاؤں آ کر جنت کو جگہ جگہ تلاش کرتا ہے۔وہ نہ اپنے گھر پر ملتی ہے اور نہ اپنے باپ ماں باپ کے گھر ،تو پریشان ہو کر وہ دلیر خان کی چوپال کا رخ کرتا ہے۔ وہاں جنت اور دلیر خان کو ایک ساتھ دیکھ کر وہ ساری سازش سمجھ جاتا ہے۔ کہ کیسے دونوں نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے اس کے جذبات اور احساسات کا خون کیا ۔اسی انتقامی جذبے کے تحت آخر کار وہ دلیر خان کو تبر کے وار سے مار ڈالتا ہے ۔مگر جنت کو لفظوں کے وار سے ہی چھلنی کرتا ہے۔اور حقارت بھرے لہجے میں کہتا ہے :

> ''میں تیرا خون نہیں کروں گا تیرا خون میری طبر کے لائق نہیں ہے۔''(۱۳)

ڈاکٹر سلیم اختر کے بقول :

> ''اب شہباز واقع قد اور بن چکا ہے دو قتل کر کے نہیں بلکہ جنت کے منہ پر توک کر۔''(۱۴)

کہانی کا دوسرا اہم کردار دلیر خان ہے۔ جو گاؤں کا نامی گرامی بدمعاش ہے۔ یہ کردار بظاہر فہم و فراست، سیاسی بصیرت ،معاشی و معاشرتی حیثیت میں اگرچہ شہباز خان سے توانا ہے ۔مگر جب شہباز خان کے ساتھ اس کا مکالمہ ہوا تو اس کا کردار اس کے سامنے ماند پڑتا دکھائی دیتا ہے ۔جب پہلی شہبازخان اس کی چوپال میں جا کر سینہ تان کر اسے بری محفل میں للکارتا ہے تو جواب میں جو بعد دلیر کہتا ہے۔ وہ الفاظ کسی طور کسی بدمعاش کے نہیں لگتے:

> ''مرے بھائی شہباز خان! تبر کو وہاں کونے میں رکھ دے۔ میری چھاتی سے لگ جا۔ آج سے تو میرا یار ہے۔''(۱۵)

ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 3, Issue I, (Jan to March 2022)

ماخذ تحقیقی مجلہ

جان ہر کسی کو عزیز ہوتی ہیں۔ چاہے کوئی بدمعاش ہو شریف انسان ہو یا کوئی۔ ہر ایک موت سے خوفزدہ رہتا ہے اور اسی خوف کے اثرات مصنف نے اپنے کردار دلیر خان کے چہرے پر بھی دکھائے ہیں۔ وہ اپنی مکارانہ سوچ اور فطرت سے کام لیتے ہوئے شہباز خان کے دل میں انتقام کی جو آگ بھڑکاتا ہے۔ خود بھی اسی انتقام کی زد میں آکر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے ۔اس افسانے میں مرکزی کرداروں کے علاوہ ایک اہم کردار نور اللہ کا بھی ہے جو جنت کا بھائی ہے۔یہ کردار اس کی بہن کے شوہر کے قتل کے بعد افسانے میں آتا ہے اور قتل کیس میں شک کی بنا پر جیل کی ہوا کھانے شہباز کے ساتھ جاتا ہے۔ جیل سے رہائی کے بعد اس کا کردار بھی قتل کیس کی طرح دب جاتا ہے۔ کہانی کے مکالموں پر غور کیا جائے تو نہایت برجستہ اور موقع محل کے مطابق ہے۔ مکالموں کے ذریعے قاری کرداروں کی نفسیات تک رسائی کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ ایک دو جگہ پر مکالمے تھوڑے سے طوالت اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ بھی شاید اس لیے کہ قاسمی صاحب چاہتے ہیں کہ ان کے قاری کی کوئی تشنگی نہ رہ جائے۔

مجموعی طور پر مکالمے کرداروں کو مزید جاندار موثر بنانے میں خاصے معاون ثابت ہوئے۔ افسانے کی ایک اور خوبی اس کا آغاز و اختتام ہے ۔چونکہ یہ مختصر کہانی ہے۔اس لیے اس کی کامیابی کا انحصار اس کی ابتدا اور انتہا کی خوبصورتی عمدگی اور حسن پر ہے۔ تبر کا آغاز موثر اور دلچسپ ہے۔ افسانہ نگار قاری کو اپنے ساتھ انگلی پکڑ کر انجام کی طرف چل پڑتا ہے۔ افسانے کی پوری فضا غم و الم کی تصویر پیش کرتی ہے۔ قاری غم الم، مایوسی ،حیرت، خوف اور ہمدردی کی مختلف کیفیات سے گزرتا ہے۔ اور آخر میں جس کرب کا شہباز کو سامنا کرتا ہے۔قاری خود کو اس سے الگ نہیں رکھ سکتا۔ انجام بڑا جاندار ہے ۔قاری کے ذہن پر نقش مرتب کر جاتا ہے :

> ”تجھے پیار کرنے کو بڑا جی چاہتا ہے پر اب تو میں یہ پیار صرف اس طرح کر سکتا ہوں کہ تبر سے تیرے ہونٹ تیرے جسم سے الگ کر لوں اور پھر ان پر اپنے ہونٹ رکھ دوں۔ مگر میں ایسا نہیں کروں گا پھانسی پر چڑھنے سے پہلے میں اپنےہونٹوں کو پلید نہیں کرنا چاہتا۔“(۱۶)

افسانے کی زبان سادہ اور سلیس ہے انداز بیاں روان ہے ۔مشکل الفاظ مصنف نے استعمال نہیں کیے۔ ایک دیہاتی لب و لہجے میں برتا گیاہے۔کہیں کہیں محاورات کا استعمال ملتا ہے مثلا الو بولنا، امت مارنا ،کلیجہ ٹھنڈا ہونا وغیرہ اس کے علاوہ جزئیات نگاری اورمنظر کشی بھی اس افسانے میں خوب کی گئی ہے ۔مجموعی طور پر یہ افسانہ کسی شاہکار سے کم نہیں۔ زندگی کا عمومی مشاہدہ اور تجربات اس افسانے میں جا بجا دکھاتے ہیں۔اس افسانے کا نفسیاتی پہلو بھی بہت خوبصورت اور اثر انگیز ہے۔

حوالہ جات

۱۔ فوزیہ اختر ،احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری مشمولہ راوی لاہور جی سی یونیورسٹی ۲۰۰۷ص ۱۱۵

۲۔ قاسمی احمد ندیم،طلوع و غروب لاہور گلوب پبلیکیشنز ۱۹۸۹ص ۱۰

۳۔ قمر رئیس پروفیسر اردو میں بیسویں صدی کا افسانوی ادب دہلی کتابی دنیا۲۰۰۴ص۱۲

۴۔ قاسمی احمد ندیم،پاؤں کا کانٹا،مشولا فنون شمارہ۳۴ لاہور،۲۰۱۳ص ۱۹۲

۵۔ انور احمد ڈاکٹر ،اردو افسانہ ایک صدیقہ قصہ،فیصل اباد مثال پبلشرز،۲۰۱۰ ص۲۷

۶۔ انعام الرحمن سحری عورت جرائم کی دلدل میں،لاہور سنگ میل پبلیکیشن،۲۰۰۱ص۱۸۳

۷۔ سلیم اختر ڈاکٹرعورت اور جنس اور جذبات،لاہور سنگ میل پبلیکیشنز ،۱۹۹۹ ص۱۲۲

۸۔ اختر ڈاکٹر سلیم،افسانہ حقیقت سے علامت تک،لاہور مکتوب عالیہ،۱۹۸۶ ص۲۲۳,۲۲۶

۹۔ احمد ندیم قاسمی،کپاس کا پھول،لاہور سنگ میل پبلیکیشنز،۲۰۱۶،ص۸

۱۰۔ ایضاً،ص۱۱

۱۱۔ ایضاً،ص۹

۱۲۔ ایضاً،ص۱۸

۱۳۔ ایضاً،ص۲۵

۱۴۔ ڈاکٹر سلیم اختر،افسانے سے علامت تک مکتوب عالیہ،۱۹۸۶ء،ص۲۲۵

۱۵۔ احمد ندیم کپاس کا پھول، لاہور سنگ میل پبلیکیشنز،۲۰۱۶ء،ص ۹, ۱۰

۱۶۔ ایضاً،ص۲۵